ZAUQ-E-TAHQEEQ
www.Zauq-e-Tahqeeq.com
etitor@zauq-e-tahqeeq.com
ISSN PRINT: 2789-8776
ISSN ONLINE:2789-8784
Volume.4,Issue No.2(2022)
(July to December)

پاکستانی اُردو ناول میں مزاحمت، سماجی تناظر میں (۱۹۴۷ء تا ۱۹۸۰ء)

Resistance in Pakistani Urdu Novel, in Social Perspective (1947 to 1980)

ڈاکٹر محمد کامران شہزاد
سرگودھا، پنجاب، پاکستان

Abstract

Since man is a social animal, the society provides various ways to improve his personality and also lays down some rules and regulations. In some places, differences are revealed in these principles and some resistance behaviors are seen. These differences and resistance behaviors of the society have been part of the narrative in the novels of Urdu novelists. An attempt has been made to highlight various aspects of social resistance in Urdu novels. These novels include Chand Gahan, Nigri Nigri Phira Masafar, Khuda ki Basti, Angan, Larki Ek.... Dil Ke Virane, Issi Shama Ke Parwane, Chehra ba Chehra Robaro, Garg Shab, Akhir Shab ka Humsafar Rahi, Rohi and Zameen are included. Humsafar Rahi

Key Words: Society,Urdu Novel, Social Resistance. various aspects, Khuda ki

"سماج" ہندی زبان کا لفظ ہے، جس کے لیے اُردو میں "معاشرہ" کا لفظ مستعمل ہے۔ عمومی طور پر انسانوں کے مجموعہ کو سماج کہا جاتا ہے کیوں کہ انسان صرف گوشت پوست کا لوتھڑا ہی نہیں بلکہ معاشرتی حیوان بھی ہے اور وہ ذی شعور اور صاحبِ نطق جانور ہے۔ اس معاشرتی حیوان کو زندگی گزارنے کے لیے معاشرے میں مقیم افراد سے ربط و تعلق کی ضرورت ہوتی ہیں، جس کے لیے وہ گاؤں، قصبہ اور شہر تعمیر کرتا ہے بعد ازاں ایک خاندانی نظام، قبیلہ اور قوم میں رہتے ہوئے جہاں زندگی کو رنگین بنانے کے جتن کرتا رہتا ہے وہیں سماجی رسم و رواج، تہذیب و تمدن کا پابند بھی ہوتا ہے۔

چوں کہ انسان سماج کے بغیر ایک درندہ ہے اس لیے سماج ہی اس کی شخصیت کو بہتر بنانے کے لیے مختلف طریقے فراہم کرتا ہے۔ انسان کی بہتر زندگی کے لیے معاشرتی اصول بھی واضح کرتا ہے، جن پر عمل کرتے ہوئے ہر معاشرے کے باسی اپنی ثقافتی تشکیل کرتے ہیں، جس کے اثرات وہاں کے سماج پر بھی پڑتے ہیں، جس طرح معاشرے کے بغیر انسان نامکمل ہے اسی طرح انسان کے بغیر سماج کا ڈھانچہ بھی نہیں بنتا ہے۔ انسانی مقاصد، تعلیم ،رویے اور رجحانات سماجی تغیر کا سبب بنتے ہیں۔

جیسے انسان مختلف عقائد و نظریات کا مالک ہوتا ہے۔ ویسے ہی معاشرے میں بسنے والے افراد بھی اپنے مزاج کے مالک ہوتے ہیں گو کہ سماج انھیں زندگی بسر کرنے کا نہ صرف ڈھنگ سکھاتا ہے بلکہ امن اور پیغام بھی دیتا ہے لیکن انسان میں مادی ہوس کے سبب زیادہ سے زیادہ دولت کمانے اور شہرت کی بلندیوں تک پہنچنے کی خواہشات جنم لیتی رہتی ہیں۔ ان خواہشات کے حصول کے لیے سماج کے افراد غیر اخلاقی رویہ اپناتے ہیں اور اپنے گردونواح میں بسنے والے انسانوں کو طبقوں اور گروہوں میں منقسم کرنے کے جتن کرتے ہیں نیز معاشرہ مختلف فرقوں میں بٹ جاتا ہے، جس کے نتیجے میں سماجی ناانصافی، ظلم و بربریت لاقانونیت اور فرد کے منفی رویے ابھرتے ہیں

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ کوئی ادب خلا میں جنم نہیں لیتا بلکہ ادب معاشرے میں قائم مثبت اور منفی رجحانات کا ترجمان ہوتا ہے۔ روزمرہ سماجی نشیب و فراز اور واقعات اس کے تخلیقی ذہن کو ممیز کرتے ہیں، جس کو فنکار اپنے قلم کی بہتر تشکیل و تعمیر میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ ادب اور سماج کا براہ راست رشتہ ہے، جو ادب کو سنوارتا ہے اسی لیے ادب کو سماج کا آئینہ کہا جاتا ہے۔[i]

انسانی زندگی کے ظاہری اور باطنی حالات بھی ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں کیونکہ ادب کا تخلیق کار کا بھی اسی سماج سے تعلق ہوتا ہے جس معاشرے میں ایسے ہی پھیلے منفی رویے مثلاً جاگیر دارانہ نظام، دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، سماجی ناانصافی، ظلم اور لاقانونیت کو فروغ مل رہا ہوتا ہے۔

اس ضمن میں ۱۸۵۷ء کی جنگ کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ ہونے والا ظلم اور ناانصافیوں کے رد عمل میں سر سید احمد خان اور ان کے رفقائے کار نے "تہذیب الاخلاق" رسالے کی وساطت اصلاحی تحریریں لکھ کر سماج میں ایک نئی روح پھونکی تھی۔ اس حوالے سے اگر اُردو فکشن کی بات کی جائے تو تقسیم سے قبل ڈپٹی نذیر احمد اور کرشن چندر نے اپنے ناولوں میں جہاں سماجی مسائل اجاگر کیے وہاں معاشرے میں پھیلی بدعنوانیوں کی بھی نشاندہی کی۔ یہ سلسلہ بیسویں صدی کے بڑے تخلیق کاروں نے اپنی تخلیقات میں جاری رکھا، بالخصوص قیامِ پاکستان کے بعد اُردو ناول میں بھی سماجی مسائل کی واضح طور پر نشان دہی کی ہے، کیوں کہ جس معاشرے میں ہمارے مہاجرین اور ادنیٰ طبقے نے آنکھ کھولی وہاں وہ تمام مسائل تھے، جن سے ایک معاشرہ دوچار ہوتا ہے۔ اُردو ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں سماجی مسائل کی اس طرح تصویر کشی کی ہے کہ جدید معاشرے کا فرد بھی پڑھنے کے بعد اپنے آپ کو اس سماج کا پروردہ سمجھتا ہے۔ راقم نے اپنے مقالے میں قیامِ پاکستان کے بعد لکھے جانے والے اہم ناولوں کو شامل کیا جن میں سماجی مزاحمت کی مختلف صورتیں اجاگر ہوتی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد تقسیم ہند کے سانحے پر خامہ فرسائی کرنے والوں میں نمائندہ نام انتظار حسین کا ہے جنھوں نے اپنے تمام ناولوں میں ہجرت کے بعد مہاجرین کے مسائل کو موضوع بنایا ہے۔

انتظار حسین کے اولین ناول "چاند گہن" (1952ء) کا بنیادی موضوع تقسیم اور فسادات کے وقت مہاجرین کے مسائل کی عکاسی اور انسانی صورت حال ہے۔ ناول کی کہانی بوجی، سبطین، کالے خان اور فیاض کے گرد گھومتی ہے، جو کہ تقسیم سے قبل یوپی کے قصبے حسن پور میں آباد تھے اور ہجرت کے بعد لاہور میں مقیم ہوئے۔ علاوہ ازیں ناول میں موجود فیاض خان کے کردار میں ایک کش مکش ہے، جو ہجرت کے بعد بے یقینی کی کیفیت سے دوچار ہے۔ انتظار حسین نے فیاض خان کے کردار کے ذریعے ناول میں سماجی مزاحمت کا رنگ بھی نمایاں کیا ہے لیکن یہ مزاحمت چھپے ہوئے الفاظ کے ذریعے ظاہر کی گئی ہے۔ فیاض زندگی بھر جدوجہد کرتا ہے اور تقسیم کے بعد نظام کو بدلنے اور اپنی مرضی کے مطابق چلانے پر قادر نہ ہو سکا۔ اس کے نزدیک عورت ایک معمولی چیز ہے لیکن "افسری" جیسی عام سی عورت اس کی شخصیت سے متاثر نہیں ہو سکی اور یوں وہ ناکامی سے دوچار ہوا اور اس ناکامی کا دکھ جس کا اظہار ناول کے آخر میں کیا گیا ہے، اسے لے ڈوبتا ہے۔ انتظار حسین نے اس کردار کی تحلیل نفسی عمدگی سے کی ہے۔ فیاض خان، افسری سے ملنے کے بعد افسردہ ہو جاتا ہے کیونکہ اب اسے مسلسل ناکامی کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ عورت دنیا کی کمزور ترین شے ہے اور اسے عورت نے ہی شکست دی ہے۔ مطلب وہ دنیا کی کمزور ترین چیز سے بھی شکست کھا چکا ہے۔ افسری کے سامنے فیاض خان نہ خود جھکتا ہے نہ اسے جھکا سکتا ہے۔

نثار عزیز بٹ کا ناول "نگری نگری پھرا مسافر" (1954ء) میں کہانی ناول کی ہیروئین "افگار" کے گرد گھومتی ہے جو رومان پرست ہے اور "منصور" سے محبت کرتی ہے لیکن محبت اور جذبۂ عشق کو ابدی بنانے لیے اس سے شادی نہیں کرتی علاوہ ازیں بچپن سے محرومیوں کا شکار ہے اور ٹی۔بی کے مرض میں مبتلا ہے۔ اس کے باطن میں دنیا کو مختلف زاویوں سے کھولنے کی جستجو رہتی ہے۔ وہ مختلف اوقات میں مختلف مردوں سے محبت جیسے لطیف جذبات کا اظہار کرتی ہے لیکن نہ شادی کرتی ہے اور نہ ہی کامیاب زندگی بسر کر پاتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان ناول کے مرکزی نسوانی کردار کے متعلق لکھتے ہیں:

> "اس ناول کا مرکزی خیال آدرش کی اسیری اس خود پرست کردار کا تحفظ ہے۔ ناول میں ایسا کوئی مقام نہیں جہاں اس نے حالات یا مضبوط شخصیت کے آگے ہتھیار ڈالے ہوں۔"(۱)

ناول نگار نے موجودہ سماج میں "افگار" جیسے مریض کو بیماری کے خلاف مزاحمت کرتے پیش کیا۔ ڈاکٹر زبیری اور ڈاکٹر بدر ناول کے دو اہم کردار ہیں ان کے ہاں ہمدردی کا عنصر نمایاں ہے۔ جو مریض کو ہمدردانہ انداز میں ٹریٹ کر کے اس کو بیماری کے خلاف مدافعت کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔ مصنفہ نے ان دونوں کرداروں کی بنت عمدگی سے کی ہے۔ افگار کو مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں سے باہر نکلنے اور ٹی بی جیسی بیماری کے خلاف مزاحمت کر کے صحت مند زندگی کی طرف پلٹنے میں ان دونوں کرداروں کا اہم حصہ ہے:

> "ڈاکٹر زبیری آیا تو اجیارا وہیں تھی۔ اتنے حسن سے یہ آدمی کس طرح بے نیاز ہو سکتا ہے یہ اکثر افگار نے سوچا تھا۔ لیکن ڈاکٹر زبیری نے ایک اچٹتی نگاہ بھی ادھر نہ ڈالی چھڑی ہلاتے ہوئے اس نے افگار سے کہا "آپ آرام کے وقت بھی لوگوں کو کھینچ لیتی ہیں اور وہ کھنچے چلے آتے ہیں۔" اجیارا نے گھبراہٹ میں پچھلے دروازے سے فرار ہونے کی کوشش کی۔۔۔ اسے اٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ افگار

مبہوت ہو گئی۔ یہ ڈاکٹر نے اجیارا کے سامنے کیا کہہ دیا۔۔۔ لیکن پچھلے چند دنوں کی ساری اذیت ان لفظوں، ان نظروں نے دھو ڈالی۔ وہ ایک دم ہلکی پھلکی ہو کر فضا میں تیرنے لگی۔"(۲)

محبت، ہمدردی، خلوص اور اپنی ذات پر دوسروں کی خوشیوں کو ترجیح جیسی خصوصیات "اجیارہ" کے ساتھ نرس میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اجیارہ کے کردار میں لاابالی پن نمایاں ہے اس میں سنجیدگی نام کو نہیں لیکن یہ چیز اس کی بیماری کے خلاف مزاحمت کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے یہاں تک کہ ناول نگار ان کرداروں کو ہسپتال میں ہنستے کھیلتے ہوئے دکھاتا ہے، جب نرس اور "افگار" دونوں مل جاتے ہیں تو انھیں اس کے ساتھ ہی باہر برآمدے میں بیٹھنے کی اجازت بھی مل جاتی ہے اب وہ دونوں برآمدے میں بیٹھ کر لڈو اور تاش کھیل سکتی ہیں، یہیں پر ناول نگار انھیں مزاحمتی انداز میں پیش کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اجازت ملنے کے بعد ان دونوں کرداروں میں ایک انجانی قوت پیدا ہو جاتی ہے یہاں تک کہ یہ دونوں بچوں کی طرح بھاگتی دوڑتی، لڈو کھیلتیں، تاش کے کھیلوں پر قہقہے لگاتیں ہیں اور دن رات نت نئی شرارتوں میں مصروف رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ سینی ٹوریم اور ٹی بی کے حقائق پس منظر میں چلے جاتے ہیں اور زندگی ایک بڑا غیر اہم اور سطحی سا کھیل بن کر رہ جاتی ہے۔"(۳)

"ناول کی ہیروئین "افگار" بھی اعلیٰ اخلاق سے مزین ہے۔ اس میں حوصلہ ہے، ہمت ہے اور یہی خوبیاں اسے مزاحمت پر اکساتی ہیں۔ ایک طرف وہ ٹی بی جیسی بیماری سے لڑتی ہے تو دوسری طرف وہ علم کا دامن نہیں چھوڑتی اور بی۔ ایس کرنے کے بعد ایم۔ ایس میں داخلہ لیتی ہے۔"(۴)

نثار عزیز بٹ کے مذکورہ ناول کا مرکزی خیال محبت ہے۔ یہاں محبت کی دونوں روئیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ ایک انسان کی انسان سے محبت اور دوسری انسان کی اللہ سے محبت۔ "منصور" کو اپنی دسترس سے باہر دیکھ کر افگار نے دل میں بسی اس کی محبت نکال کر اللہ سے محبت کا راستہ اختیار کیا پھر منصور پلٹ کر اس کی طرف آیا تو اس کے رشتے سے انکار کرتے ہوئے بھرپور مزاحمت کی۔ ناول نگار نے اس مزاحمت کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب افگار منصور کو مشورہ دیتے ہوئے کہتی ہے کہ اگر منصور حق کی راہ پر ہو اتو "قمر "خود ہی منصور کی راہ چل پڑے گی اور اگر وہ حق پر ہو گئی تو منصور اس کی راہ پر چل پڑیں گے اس لیے کہ فتح ہمیشہ حق کی ہوتی ہے۔ اسی وقت منصور مراد خان کے پاس جانے کا کہتا ہے تو افگار مزاحمتی رویہ اختیار کرتے ہوئے کہتی ہے کہ ایسے نہ کیجیے ورنہ میں زہر کھا کے مر جاؤں گی۔ منصور یہ کہتا ہے اچھا مر جایئے۔ یوں ناول نگار نے ایک مزاحمتی عنصر کو افگار کے کردار میں نہ صرف نمایاں کیا ہے بلکہ اسے منصور کے کردار کا خاصا بھی بتایا ہے۔"(۵)

فضل کریم فضلی کا نامور ناول "خون جگر ہونے تک" (1957ء) میں منظرِ عام پر آیا، ناول تقسیم سے قبل قحطِ بنگال پر مبنی ہے۔ ناول میں قحطِ بنگال (1941ء) کے دوران بنگال کے عوام کی بے چارگی، مفلسی، بھوک اور نچلے طبقے کی زندگی کو دکھایا گیا ہے۔ ناول کی کہانی "جمعدار جلیل الدین" کے گرد گھومتی ہے، جو جنگ عظیم کے بعد معاشی مسائل کے سبب اپنی بیوی اور بچے کو بچانے کے لیے اپنے اثاثے تک فروخت کر دیتا ہے لیکن سماجی ناانصافیوں کی وجہ اس کا بچہ اور بیوی موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں اور جمعدار بھوک کے سبب سرکاری لنگر خانہ کا رخ کرتا ہے جہاں پہنچنے سے قبل ہی تین افراد زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں جبکہ "جمعدار" بے ہوش ہو جاتا ہے۔ یہاں اندازہ ہوتا ہے کہ بنگال میں حیوان اور انسان میں تمیز ختم ہو گئی ہے۔ علاوہ ازیں ناول نگار نے بنگال میں قحط کے اسباب کو کرداروں کے مکالموں کے ذریعے رقم کیا ہے اور اس قحط کے دوران عوام میں ظلم، بھوک اور جہالت جیسے مسائل بھی اجاگر کیے ہیں۔ اس قحط کے دوران لاکھوں لوگ لقمہ اجل بنے اور رہی سہی کسر سیلاب نے پوری کر دی۔ قحطِ بنگال کی حقیقی تصویر کشی فضلی نے اپنے ناول میں کی ہے۔

"ناول میں انفرادی مزاحمت کا رنگ بھی جھلکتا ہے۔ طنز و مزاح کی مخصوص لہر لیے کانگرسی ہندوؤں کی ازلی بزدلی اور ڈاکوؤں کے آجانے کے بعد ان کے گھر سے فرار ہونے کی کہانی جہاں فضل کریم فضلی نے سنائی ہے وہاں ان عورتوں کے بے جگری اور دلیری کے ساتھ ڈاکوؤں کی راہ میں مزاحم ہونے کی روداد کو بھی انھوں نے بیان کیا ہے۔ یہاں ناول نگار کے ہاں انفرادی مزاحمت کا رنگ جھلکتا ہے۔"(۶)

فضلی کا اسلوب سادہ اور عام فہم ہے۔ قحط کے دنوں میں بھی جب کہ موت ارزاں اور جینا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن لگ رہا تھا۔ انھوں نے جمعدار "جلیل الدین" کے کردار کے ذریعے قومی غیرت اور حمیت کی عمدہ عکاسی کرتے ہوئے بے کسوں کی بے بسی سے فائدہ اٹھانے والوں کے خلاف

جمعدار اور ہاجرہ کے مزاحمتی رویوں کو بڑی دردمندی سے بیان کیا ہے۔ مثلاً ناول میں جب ایک شخص جمعدار کے ارد گرد پھرتا ہے اور موقع دیکھ کر ایک روپیہ اس کے ہاتھ پر رکھتا ہے اور بڑے کربناک انداز میں جمعدار صاحب کو کہا کہ۔

"یہ لو رات کو تم ہمارے برآمدہ میں سونا، یہاں جھاڑی میں کُتے سیار کا ڈر ہے۔ اپنی بیوی کو ہمارے گھر بھیج دینا۔ ذرا ہمارا پاؤں دبا دے گی"۔ لیکن یہ جملہ سنتے ہی جمعدار صاحب کو باوجود ناطاقتی کے سخت غصہ آتا ہے اور وہ دانت پیس کر اس شخص کو "حرام زادہ" کہتا ہے اور اس کے بش کوٹ کو جھٹکا دیتا ہے، جو چر سے پھٹ جاتا ہے اور جمعدار کا غصہ بھی ٹھنڈا نہیں ہوتا یہاں تک کہ وہ شخص وہاں سے بھاگ نکلتا ہے۔ ہاجرہ کا کردار بھی یہاں مزاحمتی انداز میں نظر آتا ہے، جب وہ اس ملٹری والے شخص کی طرف دیکھ کر تھوک دیتی ہے۔"(۷)

قُرۃ العین حیدر کا شہر آفاق ناول "آگ کا دریا (1959ء) میں چھپا۔ ناول میں ہندوستان کی اڑھائی ہزار سالہ پرانی تہذیب و ثقافت کو بیان کیا گیا ہے۔ ناول چار حصوں میں منقسم ہے۔ حصہ اول قدیم ہندوستانی تاریخ سے مسلم دور حکومت کی ابتدا تک محیط ہے۔ دوسرے حصہ میں مسلمانوں کے عروج کی داستان ہے۔ تیسرا حصہ اودھ کے بادشاہوں کے زوال پر مشتمل ہے اور آخری حصے میں قیامِ پاکستان کے چند برس بعد کی کہانی کی تصویر کشی کی ہے ۔ قُرۃ العین حیدر نے ناول کو مزاحمتی انداز سے پاک رکھنے کی سعی کی لیکن پھر بھی سرسری طور پر سماجی مزاحمت کی جھلک نظر آتی ہے۔

ناول کی ابتدا ہی میں سماجی مزاحمت کا رنگ ماموں بھانجے کے درمیان ہونے والی لڑائی میں نظر آتا ہے، جب ماموں کے حملے سے بچنے کی خاطر بھانجے کی فوج زبردست مزاحمت کرتی ہے اور مدافعانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے خندق کھودتی ہے تو ناول نگار نے اس کتھا کو سادہ الفاظ میں بیان کیا ہے:

"اس کے بیٹے اجات ستر و نے اپنے باپ کو فاقے دے دے کر مار ڈالا اور خود سنگھاسن پر جا بیٹھا۔ رانی نے اپنے شوہر کے غم میں رو رو کر جان دے دی۔ تب شراوستی کے پرسن جیت نے گرج کر کہا:" میری لاڈلی بہن مرنے کے لیے مگدھ نہیں بھیجی گئی تھی۔ "اتر کی جمہور تیں کاشی کوشل کے ساتھی بنیں اور کوسی نگر اور ویشالی اور شراوستی مگدھ کے مقابل صف آرا ہوئے۔ تب مگدھ کے وزرا نے ویشالی والوں کے حملے روکنے کی خاطر پاٹلی گرام کی چھوٹی سے بستی کے چاروں اور ایک فصیل بنائی ۔ مگر اجات ستر و جیتا اور اپنے ماموں راجہ پرسن جیت کی بیٹی بیاہ کر لے گیا۔"(۸)

شوکت صدیقی کا پہلا ناول "خدا کی بستی" (1959ء) قیامِ پاکستان کے بعد کراچی شہر کے باطنی حقائق کو دلیرانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ ناول میں "راجا" اور "نوشا" کلیدی کردار ہیں جو کہ غریب والدین کی اولاد ہیں اور غربت کے باعث اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ بھوک اور والدین کی تلخ مزاجی کے باعث کراچی بھاگ جاتے ہیں جہاں وہ عادی مجرم بن جاتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے ان کرداروں کے ذریعے زمانے کی ستم ظریفی کو بخوبی بیان کیا ہے۔ علاوہ ازیں نیاز کباڑی، خان بہادر، فرزند علی کے کردار راتوں رات امیر بننے کی خواہش پر ناجائز کام کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ دوسری طرف زمانے کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہی معاشرہ غریب بچوں کو کتاب پڑھنے کے بجائے گناہ کی طرف مائل کرتا ہے۔ اس کا عکس قاری کو راجا اور نوشا کی صورت میں نظر آتا ہے۔ ناول میں سماجی مزاحمت کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔

"معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم انتشار کا سبب بنتی ہے۔ جب معاشرے میں امیر طبقہ دولت کی تقسیم سے مالا مال ہو اور غریب اپنے پیٹ کے جہنم کی آگ بھی بجھانے سے قاصر ہو تو معاشرہ عدم استحکام کا شکار ہو جاتا ہے۔ جس کی عمدہ مثال ناول میں خان بہادر کا کردار ہے۔(۹)

شوکت صدیقی نے راجہ اور شامی کی دست بدست لڑائی کا نقشہ عمدگی سے کھینچا ہے یہاں انفرادی مزاحمت کا رنگ نمایاں نظر آتا ہے جہاں ایک دوسرے کو پچھاڑ دکھانے اور لڑکوں پر اپنی دھاک بٹھانے کی سعی عمدگی سے بیان کی گئی ہے:

"لڑکوں میں کھلبلی پڑ گئی۔ انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ اب دو دو ٹولیوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک ٹولی راجہ کی حمایت میں تھی ۔ دوسری للکار للکار کر شامی کو بڑھاوا دے رہی تھی۔ شامی تھا تو مریل سا مگر اس کے جسم میں بڑا کس بل تھا۔ پہلے راجہ نے ٹنگڑی لگا کر پٹخنی دی۔ شامی کو گرایا اور اوپر سے دبا کر بیٹھ گیا۔ لیکن ایک بار شامی نے نیچے سے کچکچا کر زور لگایا تو راجہ سے سنبھلا نہ گیا۔ دھڑام سے نیچے

آ گیا۔ شامی جھٹ سے اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ گردن پر گھٹنا رکھ کر دو تین گھسے جو دیے تو راجہ چیں بول گیا۔ لگا غیں غیں کرنے۔"(۱۰)

"خدا کی بستی" میں کرداروں کے رویوں میں مزاحمت کا عکس آسانی سے تلاش کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے خاں بہادر فرزند علی کی کیفیات اور احساسات کی تحلیل نفسی عمدگی سے کی ہے کہ جب وہ حاضرین کے سامنے خطاب کر رہا تھا تو حاضرین کی مزاحمت کے باعث وہ جلسے سے باہر آ گیا۔ اقتباس میں عام آدمی کی مزاحمت کے رنگ خوب دکھائے گئے ہیں۔(۱۱)

ناول میں انفرادی مزاحمت کی ایک اور جھلک اس وقت سامنے آتی ہے، جب شامی کا باپ ساتھی دکاندار سے جوا کھیلتا ہے تو عجیب شرط رکھتا ہے کہ مکھی جس کے روپے پر بیٹھے گی، رقم اس کی ہو گی۔ جب شیخ کے روپے پر مکھی بیٹھنے لگتی ہے تو شامی کا باپ کھانس کر مکھی اڑا دیتا ہے۔ مزاحمت کا یہ رویہ ناول میں اس وقت سامنے آتا ہے، جب شیخ مکھی کو چکا تا پچکارتا ہے کہ وہ اس کے روپے پر آ کے بیٹھے اس وقت وہ مکھی کو ایسے ہی بلاتا ہے جیسے وہ اس کی بات سن رہی ہو۔ ایک دفعہ تو واقعی یوں لگا کہ مکھی شیخ کے روپے پر جا بیٹھے گی اس صورت حال کو دیکھتے ہوئے شامی کا باپ زور زور سے کھانسنے لگ جاتا ہے اور مکھی اڑ جاتی ہے تو شیخ کہتا ہے کہ اس نے جان بوجھ کر زور زور سے کھانس کر مکھی کو اڑایا ہے۔ تب شامی کا باپ ہنس کر کہتا ہے کہ کھانسی پر میرا زور نہیں اب آ گئی تھی تو کھانسنا تو تھا ہی۔ شیخ کہتا ہے کچھ خدا کے غضب سے ڈرو۔ جھوٹ بولتے شرم نہیں آتی، تم جان بوجھ کر کھانسے تھے۔ بات بھی دراصل یہی تھی۔ شامی کا باپ مکھی کو بھگانے کے لیے کھانسا تھا۔ مگر یہ چال بازی وہ تسلیم کیسے کرتا۔ صاف مکر گیا۔ اور کہا کہ وہ مکھی تو اس روپے پر بیٹھنے والی ہی نہ تھی۔[1]

"پوکر اور ٹارزن کی لڑائی بھی انفرادی مزاحمت کا ایک رخ ہے جس میں دونوں نے اپنی برتری قائم رکھنے کے لیے اپنے مدمقابل کو نیچا دکھانے کی کوشش کی جس میں بالآخر یوکر کامیاب ہوا اور اس نے مار مار کر ٹارزن کا چہرہ بگاڑ دیا ناول نگار نے اس لڑائی کی منظر کشی بھی کی ہے۔"(۱۳)

خدیجہ مستور کے ناول "آنگن"(1962ء) کا بنیادی موضوع ہجرت ہے۔ ناول دوسری جنگ عظیم سے شروع ہو کر تقسیم ہند تک ختم ہو جاتا ہے۔ ناول میں بنیادی طور پر اس عہد کی گھریلو سیاست کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یوں ایک ہی گھر میں رہنے والے مختلف افراد مسلم لیگ کے حمایت یافتہ ہیں اور کہیں کانگرس کے۔ علاوہ ازیں ناول میں کہیں کہیں سماجی مزاحمت کے رنگ بھی جھلکتے ہیں۔ ناول میں مزاحمت کا انفرادی رنگ بھی ہے۔ تہمینہ کی ماں بیٹی کی شادی جمیل سے کرانے اور صفدر سے شدید اور نفرت کے اظہار کے سبب تہمینہ کی خودکشی پر باپ کا گھر چھوڑ کر دفتر میں پناہ ڈھونڈنے کی سوچ مزاحمت ہی کا رنگ ہے جو کہ ماں کے فیصلے کے خلاف ہے۔ ناول نگار نے مزاحمت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

"ابا آپ گھر میں نہیں آتے، کسی سے نہیں بولتے۔" اس نے جاتے ہی ابا سے کہا تھا، اس کی آواز بھرا رہی تھی۔ ابا نے گھبرا کر سر سینے سے لگا لیا تھا۔ تمہاری ماں نے مجھے گھر سے دور کر دیا ہے، تم کو سب کچھ معلوم ہے۔"(۱۴)

اس ناول میں معاشرتی حقیقت کی عکس بندی بھی خوب صورت انداز میں کی گئی ہے۔ مرد جب دوسری شادی کر لیتا ہے تو پہلی اولاد یادِ ماضی کا حصہ بن جاتی ہے ناول میں اولاد کو بھول کر دوسری بیوی کی قربت میں کھو جانے والے باپ سے شدید نفرت مزاحمت ہی کی ایک قسم ہے جس کو خدیجہ نے بڑی عمدگی سے اپنایا ہے۔

رشیدہ رضویہ کا اولین ناول "لڑکی ایک۔۔۔دل کے ویرانے"(1967ء) میں منظر عام پر آیا۔ ناول مرکزی کردار "امیرہ" کے آدرشوں پر مبنی ہے، جو عراق کے سردار سالامان کی لڑکی ہے۔ امیرہ بچپن سے حساس لڑکی ہے جو بچپن سے ہی عراق کی سیاست کے داؤ پیچ کو عمیق مشاہدے سے دیکھتی ہے اس کے نزدیک معاشرے کا پوش طبقہ عیاشی میں ڈوبا ہوا مگر اخلاقی حوالے سے زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ ناول میں عراق کے علاوہ پاکستان کی عصری صورت حال اور سیاسی انتشار کا بھی ذکر ملتا ہے۔ "امیرہ" یہ سمجھتی تھی کہ ہمارا ملک پاکستان ایک پر امن جگہ ہے۔ جہاں نسلی تعصب نہیں لیکن یہ تو عرب ممالک سے بھی بڑھ کر ہے ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"رشیدہ رضویہ نے عراق کے ساتھ ساتھ پاکستان کے سماجی، سیاسی اور معاشرتی حالات کو بھی اپنے ماجرے کے دائرے میں لیا ہے اور بتایا ہے کہ ہمارا ملک بھی انتشار میں عراق سے کم نہیں۔"(۱۵)

"ناول میں "امیرہ" کا کردار مزاحمت کا استعارہ ہے۔ وہ کہیں بھی ظلم نفرت، زبردستی برداشت نہیں کرتی، اس لیے وہ جہاں بھی ظلم اور زبردستی دیکھتی ہے۔ وہیں بڑھ چڑھ کر مزاحمت کرتی نظر آتی ہے۔ ناول نگار نے "امیرہ" کی اس مزاحمت کو سادہ بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ "سلامان" جب اسے کتابیں پڑھنے سے منع کرتا ہے تو مطالعہ کتب سے روکنے پر اپنے باپ کو مزاحمتی انداز میں آئینہ دکھاتی ہے۔"(۱۶)

جیسا کہ اوپر بیان کیا کہ "امیرہ" بچپن سے ہی حساس بچی تھی۔ اس لیے بچپن سے ہی اسے جھوٹ، چوری اور ظلم سے نفرت ہے اور موقع ملنے پر وہ ان کے خلاف بھرپور احتجاج کرتی ہے۔ رشیدہ رضویہ نے کردار کی کرافٹنگ عمدہ کی ہے۔ استانی کی انگریز قوم کے متعلق متضاد رائے پر ناول نگار نے "امیرہ" کی بھرپور مخالفت کرنے اور سچی رائے کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے:

"غیر ملکی ہمیشہ عرب قوم کو آپس میں لڑاتے رہے۔ پھوٹ ڈلواتے رہے لیکن پھوٹ ڈلوانے کی پالیسی انگریزی اصولوں کے خلاف ہے کیونکہ یہ پالیسی امن اور خوش حالی کے خلاف ہے اور۔۔۔۔۔!

"ارے مس جان۔ کیا کہہ رہی ہیں آپ پھوٹ ڈلوانے کی پالیسی انگریز قوم کے خلاف ہے؟ میں نے سنا ہے کہ انگریز کی پالیسی ایسی رہی ہے کہ پھوٹ ڈلواؤ اور حکومت کرو" امیرہ بات کاٹ دیتی اور مس جان سرخ نیلی ہو کر اسے سازشی خاندان کا فرد قرار دے کر جماعت سے باہر نکل جانے کا حکم دیتیں"(۱۷)

"ناول نگار نے مشرقی معاشرے میں بسنے والے خاندان میں پھیلی ہوئی نفرت کی آگ اور نفرت آلود مناظر کی عکاسی بھی بھرپور کی ہے۔ سوتیلی ماں کو گالی دینے پر ماں کی سگی بیٹی نے مزاحمتی رویہ اپنایا اور اپنے سوتیلے بھائی کو نوچنا کاٹنا شروع کر دیا۔ بڑے بھائی کے مارنے پر امیرہ نے بھرپور مزاحمت کی۔"(۱۸)

"امیرہ بحیثیت انسان بچپن سے ہی اقبال کے خودی کے تصور کی معتقد تھی۔ سکول کے پرنسپل اور امیرہ کی نوک جھوک اور امیرہ کی خودی کو بلند رکھنے کی کوشش پر پرنسپل کی مدرسہ سے نکالنے کی دھمکی اور امیرہ کی مزاحمت کو ناول نگار نے تفصیلاً بیان کیا ہے۔"(۱۹)

رشیدہ رضویہ نے دوسرے ناول "اسی شمع کے آخری پروانے" (1970ء) میں سیاسی کردار "جہاں دیدہ" کو پیش کیا ہے، جو کہ کشمیر سے تعلق رکھتی ہے لیکن مادیت پرست، خود غرض اور سیاست کے خون سے کشید ہوتی ہے۔ ناول میں جہاں دیدہ بیگم خود وزیر بننے کے چکر میں اپنی بیٹی پروین کو کسی وزیر یا جاگیر دار سے بیاہنے کی خواہش مند ہے، علاوہ ازیں ناول میں پاکستان رائٹر گلڈ کے چند ادیبوں پر نام لیے بغیر طنز کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں پروین کی سہیلی نینا کا کردار تخلیق کیا ہے گیا، جو کہ ایمان دار لکھاری تھی۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کو نینا کے کردار میں مصنفہ رشیدہ رضویہ خود موجود نظر آتی ہیں۔[2]

ناول کے اختتام میں مرکزی کردار "جہاں دیدہ بیگم" مزاحمتی کردار کے طور ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس وقت اسے وزیر اعظم محمد علی بوگرا کے خلاف احتجاج کے دوران گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ بعد ازاں اسے پاگل قرار دے کر پاگل خانے بجھوایا جاتا ہے۔ ناول کے اختتام میں جس عہد کی تصویر کشی کی گئی۔ وہ روسی وزیر اعظم کا پاکستان کا دورہ اور جنرل ایوب کے زوال کا دور ہے۔ پروین سری نگر میں کسی ہندو لڑکے سے شادی کرتی ہے تو مصنفہ پاکستان میں دولت کی ہوس رکھنے والی خواتین کو تین تین شادیاں رچانے کی مزاحمت کرتی نظر آتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان ناول کے متعلق رقم طراز ہیں:

"یہ ناول محض سیاسی افراتفری اور انتشار کا ہی احاطہ نہیں کرتا بلکہ تہذیبی اور ثقافتی اداروں کی تباہی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسی کو پاکستان جیسے اسلامی ملک میں ماجرے کی جغرافیائی توسیع کر کے واضح کیا گیا ہے۔"(۲۱)

ناول میں سماجی مزاحمت کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ رشیدہ رضویہ کے ہاں ظلم و ستم اور ناانصافی کے خلاف احتجاج، قوت کے طور پر ابھر کر سامنے آتا ہے۔ اس کے بنائے گئے کردار ظلم وزیادتی پر خاموش نہیں رہتے بلکہ آگے بڑھ کر جبر واستبداد کے علمبرداروں کی نہ صرف آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی جرات، بلکہ ان کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کی ہمت بھی رکھتے ہیں۔ اس ضمن میں "بیگم جہاں دیدہ" کا کردار سامنے آتا ہے، جب ہندو مسلم تعصب کی بنا پر ان کے شوہر کے مقابلے میں ہندوانہ ذہنیت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے تو وہ اپنا احتجاج ان الفاظ میں ریکارڈ کرواتی ہے:

> "وطن کا مفہوم پہلی مرتبہ اُس لمحہ بیگم جہاندیدہ کی سمجھ میں آیا تھا جب جہاندیدہ صاحب کی ترقی روک کر ایک ہندو افسر کو ترجیح دی گئی۔ اس زیادتی پر بیگم جہاندیدہ نے بہ نفسِ نفیس ہندو افسر کے دفتر پہنچ کر احتجاج کیا۔ احتجاج نے بہت جلد جھگڑے کی صورت اختیار کر لی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ بیگم جہاندیدہ نے ایک زوردار تھپڑ ہندو افسر کے رخسار پر دے مارا۔"(۲۲)

> "ناول نگار نے ملکی حالات کو شہر کے سماجی شعور کی روشنی میں عمدگی سے قلم بند کیا ہے۔ ایوب خان کے آخری برسوں میں سیاسی اشرافیہ کی نااہلی کے نتیجے میں بڑھنے والی سیاسی گھٹن اور جبر کے نتیجے میں عوام کی طاقت کو اپنے ہاتھ میں لینے اور ملکی وسائل کو تباہ کر دینے کے المیے کی طرف مصنفہ نے دلدوزی سے توجہ مبذول کروائی ہے۔ انھوں نے ایوب خان عہد کی عکاسی کرتے ہوئے کہا ہے کہ جب ایوب خاں کے اس اعلان کے بعد کہ وہ صدارتی انتخابات میں حصہ نہیں لیں گے۔ اس کے لیے ملک میں اسلام اور سوشلزم کا ایک نیا فتنہ بھی کھڑا کیا جا چکا تھا۔ ملک میں انتشار پھیلا دیا تھا اور اب لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ نظریاتی خانہ جنگی چھڑ چکی تھی۔ یہاں تک کہ کلام پاک کی بے حرمتی بھی کی جا رہی تھی۔"(۲۳)

ناول میں طلبا کے احتجاج اور اس احتجاج کو روکنے کے لیے پولیس کے ظلم وبربریت کی عکاسی مزاحمتی انداز میں کی گئی ہے۔ طلبا کسی بھی ملک کی ترقی کا اہم حصہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ مثبت انداز میں تعلیم حاصل کریں تو انھوں نے ملک کی باگ ڈور سنبھالنی ہوتی ہے وہ ظلم برداشت نہیں کر سکتے۔ سیاسی اشرافیہ اور پولیس کے مظالم کے خلاف طلبا کے مزاحمتی انداز کو عمدگی سے بیان کرتے ہوئے۔ ناول نگار نے عام آدمی کو بھی طلبا کے حق میں دکھایا ہے۔ ناول نگار اس واقعے کو بیان کرتے ہیں کہ جب کچھ طلبا اپنے مطالبات لے کر وزیر تعلیم کی کوٹھی کی طرف بڑھتے ہیں تو پولیس انھیں روک دیتی ہے۔ اس وجہ سے وہ منتشر ہو کر پیراڈائز سینما میں اکھٹے ہو کر نئی فلم کے پوسٹر دیکھنے لگتے ہیں۔ اسی دوران مشتاق احمد گورمانی کی اور چیف کمشنر کراچی اور پولیس کی گاڑیاں وہاں سے گزرتی ہیں تو طلبا کو دیکھ کر رُک جاتی ہیں۔ طلبا گورمانی صاحب سے گفتگو کرنے آگے بڑھتے ہیں تو چیف کمیشنر صاحب اپنے ماتحت عملے کو ان پر اشک آور گیس چھوڑنے کا حکم دے دیتے ہیں۔ طیش میں آکر طلبا عہدہ داروں پر پتھر برساتے ہیں۔ پولیس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بچوں پر ٹھیک ڈھائی بجے گولی چلا دی جس کی وجہ سے عام عوام غصے میں آکر طلبا کے حق میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ یوں ناول میں طلبا کے ذریعے ایک سماجی بغاوت ظاہر کی گئی ہے۔[3]

"جھوک سیال" (1972ء) میں سید شبیر حسین نے پاکستان کی دیہی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ اس لیے سماجی مزاحمت کی جھلک بھی نظر آتی ہے۔ مزاحمت کا ایک منظر اس وقت ابھرتا ہے جب وریاما، زینو کی بات پر یقین کرنے کے بجائے پیر و مرشد کو سچا مان کر زینو کو مارتا ہے اور سیدو پر اغوا کا الزام دھرتا ہے بعد ازاں سیدو کو مار مار کر بھرکس نکال دیتا ہے۔

> "زینو" کا کردار مزاحمتی حوالے سے جاندار کردار ہے۔ "وریامے" اور "منشی سردار محمد" کے مظالم اور قید و تنہائی بھی کارگر ثابت نہ ہو سکے اور اس نے عدالت میں سچ بتا دیا، جس کے نتیجے میں سیدو کو رہا کر دیا گیا۔ زینو عدالت میں بتاتی ہے کہ جو بیان تھانیدار، وریاما اور منشی سردار محمد نے لکھوائے ہیں، وہ سب غلط ہیں۔ اصل میں ساری کہانی جھوٹی ہے۔ زینو کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ اسے اور اس کے بھائی کو سردار محمد مجبور کر کے اس بہانے دربار پر لایا تھا کہ پیر کی سالی کی شادی ہے اور کام کاج کے لیے بندوں کی ضرورت ہے۔ چوں کہ زینو کا بھائی پیروں کا غلام ہے اور ان کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے اس لیے وہ پیر کی ہر بات مان لیتا ہے۔ پیر ایک عرصے

سے زینو پر ہوس بھری نگاہ رکھتا ہے یہ بات زینو کے بھائی کو معلوم ہے۔ لیکن وہ اپنی بہن کو پیر کی ہوس پر قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتا اور اپنی بہن کو پیر کے دربار میں چھوڑ آتا ہے۔ پیر بوس و کنار اور اس کے ساتھ زبردستی کرتا ہے، جس کی مزاحمت کے طور پر بعد ازاں زینو عدالت میں منہ بند رکھنے کے بجائے کھلم کھلا یہ بیان دے دیتی ہے۔ روایتی سماجی رویوں کے خلاف "زینو" کی یہ مزاحمت نہ صرف ایک عورت کی مزاحمت ہے بلکہ ہر اس شخص کی مزاحمت ہے جو پیری فقیری کے نظام کا ڈسا ہوا ہے۔ ناول میں زینو مزاحمت اس وقت سامنے آتی ہے جب پیر اپنی ہوس کے ہاتھوں مجبور ہو کر مجسٹریٹ کے ذریعے اسے دارالامان سے واپس بلاتا ہے تو دارالامان کی نگران بھی اسے زبردستی نکال دیتی ہے لیکن وہ دارالامان کی چھت پر چڑھ کر خودکشی کی دھمکی دے کر خود کو بچا لیتی ہے۔"(۲۵)

جمیلہ ہاشمی کا تاریخی ناول "چہرہ بہ چہرہ روبرو" (1977ء) میں شایع ہوا، جس میں ناول نگار نے ایران کے نچلے طبقے کی پابندیوں اور اخلاقی اقدار کو موضوع بنایا ہے۔ ناول کی کہانی "ام سلمٰی" کے گرد گھومتی ہے جو گھریلو عورت ہے اور بابی عقیدے کے زیر سایہ قرۃ العین طاہرہ بن جاتی ہے۔ ام سلمٰی کی آزاد روی ایرانی معاشرے میں ناقابل قبول ہے کیونکہ وہ ایران کے دستور کے خلاف باپ کا کتب خانہ استعمال کرتی ہے اور ایسی حقیقتوں سے آگاہ ہے، جن کا جاننا ایرانی معاشرے میں معیوب سمجھا جاتا ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناول میں ایرانی اسلامی تہذیب کی عکاسی کی گئی ہے اسی لیے یہ ناول کم اور ایرانی تاریخ زیادہ لگتا ہے۔ ناول میں سماجی مزاحمت کا آغاز وہاں سے ہی ہو جاتا ہے، جب قُرۃ العین طاہرہ ایرانی معاشرے کی پابندیوں اور اخلاقی اقدار کو توڑتی ہے۔ اگر رویوں میں مزاحمت کی بات کی جائے تو قُرۃ العین طاہرہ کے باپ علی محمد سے ملنے کے بعد اسے خدا تسلیم کرنے اور طاہرہ کے باپ کے اسے غلط کہنے پر طاہرہ کا بھڑک کر اپنے باپ کے مقابل آنا بھی مزاحمت کی ذیل میں آتا ہے جس کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"ماں اسے دیکھتے ہی رو پڑی وہ اس کو گلے لگانا اور لپٹنا چاہتی تھی مگر پاک اور ناپاک کا فاصلہ درمیان تھا۔ مشیت کو یونہی منظور تھا۔ پتہ نہیں اس شیرازی چھوکرے نے اس پر کیا جادو کر دیا" ملا صالح نے کہا:

"نہیں وہ شیرازی چھوکرا نہیں میرا رب ہے میرا محبوب ہے میرا خدا ہے" اس نے بہت تیزی سے کہا۔ ملا صالح نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہا تو وہ الگ ہٹ گئی ان کے اور اس کے درمیان زمانے تھے۔"(۲۶)

انسانی فطرت بڑی پُراسرار ہوتی ہے اور بالخصوص خواتین جب کسی بھی عقیدے کے زیر سایہ ہو جاتی ہیں تو وہ پھر کسی بھی قیمت پر پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتیں اور نہ ہی کسی مراعات یا دھمکی سے ڈرتی ہیں۔ ناول میں ناصر الدین بادشاہ کا قُرۃ العین طاہرہ کو لالچ دے کر بابی مذہب سے ہٹانے کی سعی کرتا ہے تو جواب میں طاہرہ مزاحمتی رویہ اپناتی ہے۔ اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"مجھے کیوں بلایا گیا ہے" القابوں کے بنا کسی خوف کے یہ عجیب طرز تخاطب تھا آج تک کسی نے اس کے سامنے کی زمین کو بوسہ دیے بنا اس سے بات نہ کی تھی۔ کیا تم "باب" کے مذہب سے تائب نہیں ہو سکتی ہو؟ میں تمہاری جان بخشی کا وعدہ کرتا ہوں۔

"یہ جان آخر جانِ آفرین کے حوالے کرنا ہی تو ہو گی۔ زود یا بدیر"

"دیوانگی کی زندگی کوئی زندگی ہے۔"

بادشاہ پتہ نہیں تم دیوانگی کسے کہتے ہو اور ہم دونوں میں سے کون دیوانہ ہے۔"(۲۷)

"مزاحمت کا ایک رخ وہاں نظر آتا ہے، جب شیخ احمد حسائی کے خلاف کفر کا فتویٰ لگانے پر اس کے مرید کی طرف سے شدید مزاحمت کے نتیجے میں طاہرہ کے چچا زاد "محمد تقی" کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ اپنے اندر عدم برداشت کے خلاف کوئی بات نہیں سن سکتے ہیں۔"(۲۸)

اکرام اللہ کا ناول "گرگ شب" (1978ء) میں تخلیق ہوا۔ اس میں ایک ایسے فرد "ظفر" کی کہانی بیان کی گئی ہے، جو نفسیاتی اور جذباتی طور پر انتشار کا شکار ہے، جس کی پیدائش ناجائز تعلق کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرتا ہے کیونکہ ناجائز اولاد ہونے کا احساس چین سے

جینے نہیں دیتا تو وہ شہر آ جاتا ہے۔ شہر آ کر بڑا بزنس مین بن جاتا لیکن یہاں بھی احساس ندامت اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ اپنی ذہنی اذیت کو دور کرنے کے لیے شراب نوشی کا سہارا لیتا ہے، جہاں سے موت ہی اس کو چھٹکارا دلا سکتی ہے۔ مجموعی حوالے سے یہ ناول پاکستان میں پابند اور گھٹے معاشرے میں جنس کے تعلق کو منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔" ظفر "عورت کا قرب حاصل کر بھی لیتا ہے لیکن پھر حساس نفسیاتی کش مکش میں زندگی گزارتا ہے۔

ناول میں انفرادی مزاحمت کے رنگ نظر آتے ہیں۔ مرکزی کردار کو اپنے بھائی کا بیٹا ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے، جس کی وجہ سے وہ زندگی سے فرار چاہتا ہے تو کہیں تخیل کا سہارا تلاش کرتا ہے اور کہیں آنکھیں موند لیتا ہے۔ نہر میں نہاتے ہوئے دوست کے منہ سے وہی بات سن کر اس کی حالت شرم سے غیر ہو جاتی ہے تو وہ جس کے طرزِ عمل کا اظہار کرتا ہے اس کی عکاسی اکرم اللہ نے ان الفاظ میں کی ہے:

> "میں بہت دیر تک پانی کے نیچے چھپا رہا۔ وہاں ایک بے حد دھندلا مٹی کے رنگ کا مبہم سا جالا پھیلا تھا جس میں کچھ دکھائی نہیں پڑتا۔ اس خاموشی میں گزرتے ہوئے پانی کی بے حد ہلکی سائیں سائیں اور میرے پھڑ پھڑاتے دل کی دھڑکن سنائی دے رہی تھی۔ میں کچھ سوچ نہیں رہا تھا، کسی بے انصافی کا احساس نہیں تھا۔ صرف ایک خواہش تھی کہ میں کبھی باہر نہ نکل سکوں تاکہ میرے خجل، شرمندہ بدن کو دوبارہ اس کی نظروں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔"(۲۹)

مزاحمت کا ایک رخ انفرادی اور سماجی تناظر میں دکھایا گیا ہے۔ ناول نگار نے مرکزی کردار کی الجھنوں اور وحشتوں کا اظہار کر کے ان سے فرار کی سوچ کا اظہار عمدگی سے کیا گیا ہے مرکزی کردار کی نفسیاتی تحلیل اور مزاحمت کے انداز کو اس اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

> "۔۔بیڈ روم۔ جہاں لیٹ کے خوفناک خواب آتے ہیں۔ میں آج رات سوؤں گا ہی نہیں اور بتی روشن رہے گی۔ میں ان خوابوں کو مجبور کر دوں گا کہ ننگے ہو کر میرے سامنے آئیں تاکہ میں انہیں اپنی آنکھوں سے دیکھوں، اپنے ہاتھوں سے ٹٹولوں، محسوس کروں، اپنے کانوں سے ان کی آوازیں سنوں اور پھر ان میں کوئی حقیقت ہے تو اپنے آپ کو ان کی کربناک اور خوفناک حقیقت میں جذب کر دوں۔ ہمیشہ کے لیے خاموشی سے اپنا آپ ان کے سپرد کر دوں جس طرح تمام گناہ گار جہنم میں ،ایک خاموشی سے، صبر سے اپنی قسمتوں پر شاکر، اپنے نصیبوں پر قانع جذب ہو جائیں گے۔ یہ پھر ان خوابوں سے مجھے مستقل طور پر چھٹکارا مل جائے گا۔ آخر اس روز روز کی دانتا کل کل کو کسی طور پر ختم کرنا چاہئے۔"(۳۰)

قُرۃ العین حیدر کا ناول "آخر شب کے ہمسفر"(1979ء) میں شایع ہوا۔ یہ ناول تقسیم سے قبل 1942ء میں بنگال کی تحریک دہشت پسند اور انقلابی تحریک سے قیام بنگلہ دیش کے عرصہ تک محیط ہے۔ قُرۃ العین حیدر کے مذکورہ ناول کا مرکز بھی بنگال ہے۔ "ریحان الدین" ناول کا مرکزی کردار ہے، جو سامراجی نظریے کے باعث دہشت پسند تنظیموں کا حصہ بن جاتا ہے اور مرکزی نسوانی کردار دیپالی سرکار جو ہندو گھرانے سے تعلق رکھتی ہے ،جو حصول آزادی کے لیے ریحان الدین کے ساتھ دہشت گرد تنظیم میں حصہ لیتی ہے۔ ناول کے آخر میں ریحان الدین کے بدلتے نظریات کو دکھایا ہے کہ جو پاکستان سے ہی مغربی پاکستان میں کانگرس کا حصہ بن جاتا ہے اور بعد ازاں عوامی مسلم لیگ کی مقبولیت کے دیکھتے ہوئے ان کی سیاست کا پرچار کرتا ہے۔ ناول نگار نے بڑی ہنرمندی سے دکھایا ہے کہ اشتراکیت پسند کیسے حالات سے سمجھوتہ کر لیتے ہیں۔

> "ناول میں کئی حوالوں سے مزاحمتی رجحان نظر آتا ہے سماجی مزاحمت کا پہلا واقعہ ناول کے آغاز میں ہی اس وقت سامنے آتا ہے، جب "بریسٹر رائے برہمو" کے آباواجداد کے احتجاج کا تذکرہ کیا کہ وہ بچپن کی شادی اور دوسری سماجی برائیوں کے خلاف جہاد اور آزادی نسواں کا پرچار کرتے تھے۔ اب ان کی لڑکی اٹھائیس سال کی تھی اور وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ماں باپ اسے زبردستی بیاہ نہیں سکتے تھے۔ تب ہی وہ سوچتے تھے کہ انقلاب اپنے ہی بچوں کو کھاتا ہے۔(۳۱)

مزاحمت اور بغاوت انسان کے خون میں شامل ہے عزت دار اور غیرت مند کبھی بھی اصولوں پر سمجھوتا نہیں کرتے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ فرد یا چند افراد حکومت کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تاہم حکومت ان کو مٹا بھی نہیں سکتی کہ اگر وہ ایک کو تشدد کا نشانہ بناتی ہے تو اس کی حمایت میں دس افراد

نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ قُرۃ العین حیدر کے ہاں مزاحمت کے حوالے سے یہ جو رویے دیکھنے میں آتے ہیں۔ اس کے اسباب و علل پر بھی انھوں نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔

"دیپالی سرکار" کا مزاحمت کی راہ پر چلنا اور باغیوں کی مدد کرنا بے وجہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے اس کے چچا کو دی جانے والی پھانسی اور اس پھانسی کو رکوانے کے لیے اس کے باپ کی سر توڑ کوشش بے فائدہ رہی، جو اس کے چچا کی پھانسی کو نہیں رکوا سکی۔ یہ واقعہ بھی دیپالی کے کردار میں مزاحمتی عنصر غالب آنے میں مشعل راہ بنا۔(۳۲)

"جزیشن گیپ کو بھی ارضی حقیقتوں کی روشنی میں قُرۃ العین حیدر نے بیان کیا ہے "روزی" کا کردار بغاوت کا آئینہ دار ہے۔ رویوں میں مزاحمت کی عمدہ مثال والد کی طرف سے رشتے کی منظوری کے باوجود "روزی" نے باپ کا خیال نہ رکھا اور رشتے سے انکار کر دیا۔ باپ اور بیٹی کے خیالات میں عدم توازن مزاحمت کا سبب بنا۔"(۳۳)

"قُرۃ العین حیدر کے ہاں سماجی شعور بے رحم حقیقت نگاری کے تناظر میں تمام تر ناکامیوں کے ساتھ موجود ہے۔ اونچے گھروں کا احساس برتری نوجوان لڑکیوں کا مناسب بر نہ ملنا، بڑے گھرانوں کے لڑکوں کا نا اہل، نالائق، سست ہونا اور متوسط طبقے میں شادی کرنے سے ناک کٹنے کا احتمال ان تمام مناظر کی عکس بندی مہارت اور اختصار سے بیان کی گئی ہے۔"(۳۴)

"قُرۃ العین حیدر کے ہاں مزاحمت مختلف صورتوں میں جلوہ افروز ہوتی ہے ایسی ہی ایک صورت رویوں میں مزاحمت کی ہے، جس کا مظاہرہ پادری بیز جی کی ذہنی غلامانہ سوچ کے خلاف صنفی اور مذہبی تعصب کے خلاف اس کی بیٹی روزی کی طرف دیکھنے میں آتا ہے۔ پادری مسلمانوں اور ہندوؤں کے خلاف ہے تو بیٹی اس کے عیسائی تعصب کی دھجیاں بکھیرتی ہے۔(۳۵)

مشکل اور مصیبت کی گھڑی میں خدا پرست کی سوچ میں فرق کو قُرۃ العین حیدر نے جس طرح بیان کیا ہے وہ مبنی بر حقیقت اور فطری ہے ۔ انسان چاہے جس مذہب سے تعلق رکھتا ہو اگر خدا کے ساتھ اس کا تعلق مضبوط نہیں ہے تو مصیبت کے عالم میں وہ شکوہ کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہے۔ ظلم اور بربریت کا بازار گرم کرنے والے اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ یہ انسان کے گھروں تک بھی پہنچ جاتی ہے اس مکمل صورت حال کی عکاسی ان الفاظ میں کی ہے:

"ہاہاہا۔۔۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان اور نیک دل باپ کو آدم خور شیر کا نوالہ بنا دیا۔ میری جوان اور معصوم پھوپھی کو چینیوں سے Rape کروا کے قتل کرا دیا۔ اس رحیم و کریم نے میرے جوان بھائی کو جرمنی کے اندھیرے آسمان پر پرخچے اڑا دیے۔ وہ رحیم و کریم اس وقت ساری دنیا کے لاکھوں بے گناہ انسانوں کو طرح طرح کی موت مار رہا ہے۔ وہ رحیم و کریم اسی بنگال میں ہر سال ان گنت بے گناہ اور مصیبت زدہ انسانوں کو طوفانوں اور سیلابوں اور وباؤں کی نذر کرتا ہے۔ اور یاد رہے تمہارا وہ رحیم و کریم خدا ننھے بچوں کو اپاہج اور اندھا کر دیتا ہے۔" وہ ایک دم چپ ہو گیا۔ "سوری پادری"(۳۶)

احمد داؤد کا ناول "رہائی" (1979ء) میں مارشل لا کے عہد میں دو پاکستانی شہریوں کی ہم جنس پرستی کے علاوہ جذباتی گھٹن اور معاشی استحصال کو موضوع بناتا ہے۔ ناول کا ہیرو پینتالیس سالہ تنہا شخص ہے، جو کہ اپنے بھائی بہنوں کے مستقبل کو سنوارتے اپنا مستقبل بگاڑ دیتا ہے۔ وہ عہد مارشل میں عصر حاضر کی فرسٹریشنز اور گھٹن کے باعث تنہائی محسوس کرتا ہے اور تنہائی کو دور کرنے کے لیے نوجوان کی ہم نشینی اختیار کرتا ہے۔ ان کے کمرے کے نزدیک ایک زنانہ ہاسٹل بھی موجود ہے جہاں کی خواتین کو ملک کا مقتدر طبقہ اپنی ہوس مٹانے کے لیے راتوں رات استعمال کرتا ہے۔ نوجوان جب عورت کے نزدیک آتا ہے تو ناجائز بچہ کوڑے کے ڈھیر میں پھینکنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس ذلت کا انتقام لینے کے لیے ہیرو قانون کے شکنجے میں پھنس جاتا ہے جہاں سے وہ پاگل خانے منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف ناول کے موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

"یہ ان معتوب شہریوں کی کہانی ہے جو تمام معزز اور مقتدر کہلائے جانے والے طبقے کی ضروریات پوری کرتے ہیں اور وقت پڑنے پر ان کے جرائم کی پردہ پوشی بھی کرتے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کے رہنما ،مختلف شعبوں کے دلال، اسمگلرز اور نت نئے رنگ بدلتے دانش وراس معاشرے کے روحِ رواں ہیں اور معاشرے کا نچلا طبقہ ان کی بدعنوانیوں اور ہوس برداری کے گھناؤنے کام میں آلہ کار بنتا ہے۔"(۳۷)

ناول میں انفرادی مزاحمت کے کئی بھی پہلو دیکھے جاسکتے ہیں۔ اس ضمن میں پہلا واقعہ جب عاشق کی اپنے معشوق کے ساتھ دلی وابستگی کے ہیجان خیز لمحوں کا اظہار یہ توبہ شکن بھی ہے اور عبرت انگیز بھی۔ منزل کے پاس جا کر خود کو گناہ سے دور کر لینا دل گردے کا کام ہے اور یہی کام مرکزی کردار نے خود سے مزاحمت کر کے پیش کیا اقتباس ملاحظہ کیجیے:

"رات کی سرد بانہوں میں ہم کمرے میں آپس میں لپٹے پڑے پڑے جب ایک دوسرے کے اندر جھانکتے تو اندیشوں اور سوالوں کے دہکتے الاؤ نظر آتے۔ رات کے کسی لمحے اچانک وہ مٹھیاں بھینچ کر چلاتا ہوا اُٹھ بیٹھتا۔ ایسے موقع پر میں پوری قوت کے ساتھ اُسے اپنی طرف کھینچ لیتا اور جب وہ میرے پہلو میں پڑا ہوتا تو کبھی کبھار کسی شیطانی لمحے، شہوت کی تند خو لہر میرے رگ وپے میں سر اُٹھاتی۔ موجِ محبت کے اس عالم میں میرا جی چاہتا کہ کمبل کے اندر اُسے بے لباس کر دوں۔ اُس کے ذہن اور بدن کی تہوں میں رینگتے غیر مادی وسوسوں اور دُکھوں کو اپنے بوسوں سے تسخیر کر لوں۔(۳۸)

ناول نگار نے مزاحمت کا ایک نیا رخ متعارف کروایا ہے۔ یہاں مزاحمت انفرادی بھی ہے اور گناہ کے خلاف بھی ہے۔ مرکزی کردار اپنے دوست سے مزاحمتی انداز اپناتا ہے وہ اس سے بغل گیر ہوتا ہے، جب اس نہج پر پہنچتا ہے، جہاں وہ قوم لوط کی ہمسری کرنے لگے تو وہ مزاحمت پر اتر آتا ہے۔ اور خود کو بچا لیتا ہے احمد داؤد نے سادہ لفظوں میں مرکزی کردار کی نفسیات بیان کی ہیں۔

مشرقی معاشرے میں باپ کا مقام و مرتبہ دیگر معاشروں سے الگ تھلگ ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی باپ کی مار اور معاشرتی جبر کے خلاف مرکزی کردار کی مزاحمت کو احمد داؤد نے دیانت داری سے بیان کیا ہے۔ مرکزی کردار باپ کی مار تو کھا لیتا ہے لیکن گھر چھوڑنے کے بعد دوبارہ گاؤں کبھی واپس نہیں آتا ہے۔ دراصل اسے ڈر تھا کہ وہ باپ کو اگر سب کچھ سچ بتا دے گا تو اس کا باپ سکول جا کر اس کے استاد کا سر پھاڑ دے گا۔ اس لیے باپ کی بے انتہا مار کھانے کے بعد بھی وہ زبان بند رکھتا ہے لیکن اپنا گاؤں چھوڑ کر شہر چلا جاتا ہے۔ بس کبھی کبھی وہ اپنی خیریت سے اپنے باپ کو مطلع کر دیتا تھا۔

احمد داؤد طنز بھی کرتے ہیں تو اتنے خوشگوار موڈ میں کہ قاری بھونچکارہ جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں سب سے باعزت طبقہ مولوی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہی مولوی عام مسلمان کو نیک راہ سے ہٹانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ ناول میں مولوی کے مرکزی کردار کو مسجد میں سونے سے منع کرنے اور مسجد میں زبردستی بے دخل کرنے کی وجہ سے مرکزی کردار نے مستقبل میں مسجد سے ناطہ توڑ دیا۔ یہ بھی مزاحمت کا ایک رخ ہے کہ مسلمان مرکزی کردار کو مسجد سے دور کرنے میں مولوی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

جمیلہ ہاشمی نے ناول "روھی"(1980ء) میں بلوچستان کے قبائلی علاقے "روھی" کے شب و روز بیان کیے ہیں۔ ناول میں مرکزی کردار کے خود کو منوانے، خود سے محبت کرنے کی کہانی ہے۔ مرکزی کردار زمیندار کا بیٹا ہے، جو باپ کی بات پر ناراض ہو کر صرف خود کو منوانے کی غرض سے فوج میں بھرتی ہوتا ہے اور "روھی" کے علاقے میں مریم نامی حسینہ کو دل دے بیٹھتا ہے۔ اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے بعد اسے حالات کے بہتے صحرا میں برہنہ چلنے اور زندگی بھر انتظار کی سولی پر لٹکنے کی سزا دینے والے ایک خود پرست کی زندگی کے مزاحمتی رنگ کو جمیلہ ہاشمی نے بے مثال منظر کشی کے ذریعے ترتیب دیا ہے۔

ناول نگار نے ایسے الفاظ کا چناؤ کیا جو اپنے سحر سے قاری کو گرفت میں لے لیتے ہیں۔ دشمن کی فوج کے حملے کے جواب میں پاکستانی فوج کی طرف سے مزاحمت کے انداز کو دلفریب نثر میں خوب صورتی سے بیان کیا گیا ہے۔ ایک طرف خود کو ثابت کرنے والے امیر زادہ کی تنہائی، ناکامی کی داستانِ

حسرت ہے تو دوسری طرف دشمن کی مذموم کارروائیوں اوران کی جیت کی راہ میں حائل کم سن لڑکے کی دیوانگی کی حد تک جاتی بہادری کا تذکرہ ہے۔ جمیلہ ہاشمی نے دونوں کرداروں کی نفسیاتی تحلیل عمدگی سے کی ہے:

> "زخمیوں کے دیکھنے میں اور پیرن گئے وہ آنکھیں بند کیے لیٹے تھے اور ہوش میں ہونے کے باوجود کراہتے تک نہ تھے۔ دشمن اور دوست سب برابر پڑے تھے ایک کم سن لڑکا جس کی مسیں ابھی نہیں بھیگی تھیں، ہنستا ہوا اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے جھک کر کہا۔ "افسوس ہے تم زخمی ہوگئے۔" "اس میں افسوس کی کیا بات ہے، میں سب سے آگے تھا ان تینوں کو بھی میں نے نشانہ بنایا تھا"۔ اس نے بازو سے دشمن کے سپاہیوں کی طرف اشارہ کیا" ایسے میں ایک آدھ خراش لگ جانا کیا ہے۔ ہم نے برستی گولیوں میں کبھی ہار نہیں مانی۔ میں بلند خاں کا بیٹا ہوں۔ عیسیٰ خاں کا چھوٹا بھائی۔ مریم میری بھابھی ہے۔(۳۹)

خدیجہ مستور نے اپنے ناول "زمین" (۱۹۸۰ء) میں جہاں تقسیم ہند اور فسادات کے دوران پاکستانی عوام کے ناروا سلوک کے خلاف مختلف صورتوں میں مزاحمتی رنگ واضح کرنے کی سعی کی ہے وہیں ہندوستانی اور پاکستانی سماجی رویوں کے خلاف بھی مزاحمتی انداز نظر آتا ہے۔ ناول میں " سلیمہ " کی ماں مالک سے محبت کرتی ہے، یہی وجہ ہے کہ سلیمہ کے باپ کے مرنے کے بعد اس نے سلیمہ کی بجائے کاظم کو ساری محبت دی تاکہ مالک کی محبت جیتی جاسکے۔ نتیجتاً سلیمہ کے دل میں محبت کے بجائے نفرت کے الاؤ روشن ہوگئے اوراس نفرت نے سلیمہ کی ماں کو برباد کر کے رکھ دیا۔(۴۱)

ساجدہ کا باپ غریب ہونے کے باوجود خوددار اور نیک انسان تھا۔ انہیں قدرت نے ظلم کا موقع ہی نہیں دیا اس سے پہلے کہ وہ پاکستان میں کوئی فائدہ اٹھاتے موت نے اچک لیا، ساجدہ کی اصل حقیقت کا علم ہو جانے کے بعد سلیمہ کی والدہ نے اسے گھریلو نوکرانی بنانا چاہا لیکن ساجدہ نے اسے دلیری کے ساتھ آئینہ دکھادیا۔ مزاحمت کا یہ رنگ اس اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

> "مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں یہاں رہ کر اپنی تعلیم پوری کرلوں گی۔ رہ گئے برتن، تو خالہ بی! آپ بھی میرے ساتھ اٹھوایئے، میں تاجی نہیں ہوں۔" وہ تیزی سے کمرے سے نکل گئی۔ سب کے ایک ساتھ بولنے کی تیز آوازیں اس کا پیچھا کر رہی تھیں۔(۴۰)

چونکہ انسان سماجی حیوان ہے اس لیے سماجی عناصر کے ذریعے انفرادی، اجتماعی اور تہذیبی زندگی کا خمیر بنتا ہے۔ اُردو ناول بھی انسانی زندگی کو اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ پیش کرنے کا اہم ادبی ذریعہ ہے۔ ناول نگار کو زندگی کے جتنے حقیقی نقوش دستیاب ہوتے ہیں وہ اپنی فہم کے مطابق ان نقوش کو کہانی کی صورت میں ڈھال کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جس معاشرے کی تشکیل ہوئی اس میں سب سے پہلے ہندوستان سے آئے مہاجرین کے سماجی مسائل نمایاں ہیں۔ اُردو ناول نگاروں نے آغاز سے لے کر عہد حاضر تک ایسے متعدد کرداروں کی تحلیل نفسی کی ہے، جو ہمارے سماجی مسائل کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ اوران کے ردعمل میں مزاحمتی اور احتجاجی رویہ اپناتے ہیں۔ جس کا اظہار اُردو کے ہر ناول نگار نے اپنے ناولوں میں برملا کیا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ افضال بٹ، ڈاکٹر، اُردو ناول میں سماجی شعور، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص: ۱۴

۲۔ صالحہ زریں، اُردو ناول سماجی اور سیاسی مطالعہ، الہ آباد: سرسوتی پریس، ۲۰۰۰ء، ص: ۴۵

۳۔ انتظار حسین، چاند گہن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۲ء ص: ۱۶۴

۴۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اُردو ناول، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۰۳

۵۔ نثار عزیز بٹ، نگری نگری پھرا مسافر، مشمولہ مجموعہ نثار عزیز بٹ، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص: ۷۰

۶۔ ایضاً، ص: ۷۹

۷۔ ایضاً، ص: ۲۳۴

۸۔ ایضاً، ص: ۵۱، ۵۰

۹۔ فضل احمد کریم فضلی، خون جگر ہونے تک، کراچی: دبستان ناشرین، ۱۹۶۰ء، ص: ۸۶، ۸۵

۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۸۹، ۲۸۸

۱۱۔ قُرۃ العین حیدر، آگ کا دریا، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۶ء، ص: ۲۷، ۲۶

۱۲۔ شوکت صدیقی، خدا کی بستی، کراچی: رَ کتاب پبلی کیشنز، ۲۰۱۳ء، ص: ۲۹۰، ۲۸۹

۱۳۔ ایضاً، ص: ۸

۱۴۔ ایضاً، ص: ۲۸۱

۱۵۔ ایضاً، ص: ۲۷

۱۶۔ ایضاً، ص: ۳۰۲

۱۷۔ خدیجہ مستور، آنگن، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء، ص: ۶۵

۱۸۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، رشیدہ رضویہ کے تین ناول، مشمولہ، اُردو ناول کے چند اہم زاویے، کراچی: انجمن ترقی اُردو، ۲۰۰۹ء، ص: ۲۳۱

۱۹۔ رشیدہ رضویہ، "لڑکی ایک۔۔۔دل کے ویرانے، لکھنؤ: اُردو پبلی کیشنز، ۱۹۷۰ء، ص: ۶۶

۲۰۔ ایضاً، ص: ۴۲

۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۴

۲۲۔ ایضاً، ص:۶۴

۲۳۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اُردو ناول کے چند اہم زوایے، ص:۲۳۱

۲۴۔ ایضاً، ص:۲۳۴

۲۵۔ رشیدہ رضویہ، اسی شمع کے آخری پروانے، لاہور، التحریر، ۱۹۷۰ء ص:۱۴

۲۶۔ ایضاً، ص:۴۱۲

۲۷۔ ایضاً، ص:۸۹

۲۸۔ ایضاً، ص:۲۷۶

۲۹۔ جمیلہ ہاشمی، چہرہ چہرہ رُوبرو، لاہور: ن رائیٹرز بک کلب، س ن، ص:۷۷

۳۰۔ ایضاً، ص:۱۰۷

۳۱۔ ایضاً، ص:۸۱

۳۲۔ اکرام اللہ، گرگِ شب، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۷۸ء، ص:۹۶،۹۷

۳۳۔ ایضاً، ص:۹۱

۳۴۔ قُرۃ العین حیدر، آخر شب کے ہمسفر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۱۷

۳۵۔ ایضاً، ص:۳۴،۳۳

۳۶۔ ایضاً، ص:۷۸

۳۷۔ ایضاً، ص:۸۷

۳۸۔ ایضاً، ص:۱۶۱

۳۹۔ ایضاً، ص:۲۰۶

۴۰۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، لاہور: فکشن ہاوس، ۲۰۰۵ء ص:۲۹۶